اسلامی نظامِ معاشرت کا ایک بہت اہم پہلو

جناب حکیم شریف احسن صاحب

(۲)

حُسنِ جوار چونکہ معاشرہ میں اخوت و محبت کی فضا پیدا کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ اِس لیے حضوؐر نے اس کی تائید کے لیے نئے نئے اسلوب اختیار فرمائے۔ پہلے گذر چکا ہے کہ آپ نے موذی ہمسایہ کے ایمان کی نفی کی۔ ایک اور حدیث میں آپؐ نے اس قبیح فعل کے بُرے نتیجہ کو یوں بیان فرمایا ہے کہ" وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کے پڑوسی اس کی ایذا رسانیوں سے محفوظ نہ ہوں"[۱] یہ سزا موذی ہمسایہ کے مناسب حال ہے جو شخص اللہ کے بندوں میں سے بھی خاص کر اپنے پڑوسیوں کو اذیت پہنچاتا ہے اللہ اُسے ابدی راحت کے مقام جنت میں کیوں داخل کرے! اس سے معلوم ہوا کہ ایذائے ہمسایہ ایسا مذموم فعل ہے جو نیکیوں کو جلا کر رکھ دیتا ہے۔ اس کا مؤثر اور دل نشین بیان عہدِ رسالت کے اور واقعہ میں ملتا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک عورت کے بارے میں عرض کیا کہ اس کے کثرت کے ساتھ نماز پڑھنے، روزے رکھنے اور خیرات دینے کا بہت چرچا ہے، لیکن اپنی زبان سے وہ اپنے پڑوسیوں کو تکلیف دیتی ہے۔ فرمایا: اس میں کوئی بھلائی نہیں؛ وہ دوزخ میں جائے گی"۔ اس شخص نے ایک اور عورت کے متعلق بتایا کہ اس کا ذکر

۱؎ مسلم الصحیح ۱/۵۰

کم نماز پڑھنے، کم روزے رکھنے اور کم خیرات کرنے سے کیا جاتا ہے۔ اور وہ پنیر کے ٹکڑے صدقہ میں دیتی ہے۔ البتہ وہ اپنی زبان سے اپنے ہمسایوں کو ایذا نہیں پہنچاتی۔ فرمایا: "وہ جنت میں جائے گی"[1]

اِس حدیث سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام میں انسانوں کے ساتھ انسانوں کے رویہ کو کتنی اہمیت ہے اور ہمسایہ کو ایذا رسانی اور وہ بھی محض زبانی، اگر ڈھیروں عبادات کو راکھ میں تبدیل کرسکتی ہے تو عملاً ایذا دینے کی سزا کتنی سنگین ہوگی! یہ حدیث معارف کا ایک گنجینہ ہے۔ لیکن یہاں اس پر مفصل گفتگو کی گنجائش نہیں۔ بس اتنا یاد رکھیے کہ حقوق العباد کے سلسلے میں یہ قولِ فیصل ہے۔ اس حدیث کی رُو سے حقوق العباد کی ادائیگی یا عدم ادائیگی پر کسی کے جنت یا جہنم میں جانے کا فیصلہ ہوتا ہے۔ حقوق العباد کی یہ اہمیت اس وجہ سے ہے کہ وہ صرف حقوق العباد نہیں، حقوق اللہ بھی ہیں۔ کیوں کہ ان کے ادا کرنے کا حکم اللہ ہی نے دیا ہے۔ اس طرح بندوں کا ایسا کوئی حق نہیں جو اللہ کا حق بھی نہ ہو، لہٰذا ان کی اہمیت زیادہ ہے۔ یہ حدیث حضورؐ کے اس ارشاد کو بھی سمجھنے میں مدد دیتی ہے کہ خیر الجیران عند اللہ خیرھم لجارہٖ[2] یعنی اللہ کے نزدیک سب سے اچھا پڑوسی وہ ہے جو پڑوسیوں کے لیے سب سے اچھا ہو۔ یہ اس لیے کہ وہ بندوں کے اس حق کی ادائیگی میں ــــ جو اللہ کا حق بھی ہے ــــ سب پر سبقت لے گیا۔

اوپر بعض زبانی ایذا کا ذکر ہوا ہے۔ اب دیکھیں عملاً اذیت رسانی کا گناہ کس درجہ سنگین ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک روز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے زنا کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے عرض کیا "حرام ہے، اللہ

---

[1] احمد بن حنبل، مسند، المکتبۃ الاسلامیہ بیروت، ۱۳۸۹ھ۔ بخاری، الادب المفرد واثریہ سانگلہ ص ۴۲۔

[2] ترمذی، سنن۔ مجتبائی دہلی ۱۳۴۲ھ، ۲/۱۶۔ بخاری الادب المفرد ص ۴۰۔

اور اس کے رسولؐ نے اسے حرام کیا ہے"۔ فرمایا: "پڑوسی کی بیوی سے زنا کرنا دس عورتوں کے ساتھ زنا کرنے سے بدتر ہے"۔ پھر آپ نے چوری کے متعلق دریافت فرمایا۔ صحابہؓ نے جواب دیا: "حرام ہے، اللہ اور اُس کے رسولؐ نے اسے حرام کیا ہے"۔ فرمایا: دس گھروں میں چوری کرنے سے سنگین تر جرم پڑوسی کے گھر میں چوری کرنا ہے[1]"۔ ایک اور موقع پر ایک سوال کے جواب میں آپؐ نے پڑوسی کی بیوی کے ساتھ بدکاری کو خدا کے ساتھ شرک اور قتلِ اولاد کے بعد سب سے بڑا گناہ قرار دیا ہے[2]۔

لسانِ نبوت پر ان جرائم کا اس درجہ سنگین قرار پانا عقلی تقاضوں کے بالکل مطابق ہے۔ پڑوسی پر حق ہے کہ وہ اپنے ہمسایہ کی عزت و آبرو اور مال و دولت کی حفاظت کرے۔ اس نے انہیں پامال کیا۔ اس لیے اس کے جرم کی شناعت دس گنا سے زیادہ ہو گئی۔

ایذائے جار کے بارے میں اسلام نے اپنے مزاج کے مطابق تعزیر عاید کرنے کے بجائے لوگوں کے ایمان، اخلاق اور ضمیر سے اپیل کی ہے اور انہیں اس کے ہولناک اُخروی نتائج سے خبردار کیا ہے، لیکن یہ بھی نہیں کہ یہاں اس کی کھلی چھٹی ہے۔ حضورؐ کے سامنے ایک شخص نے اپنے ایذا رساں ہمسائے کی شکایت کی۔ آپؐ نے اُسے صبر کی تلقین فرمائی۔ دوسری یا تیسری مرتبہ جب وہ یہی شکایت لے کر آیا تو آپؐ نے فرمایا: اپنا سامان گھر سے نکال کر رستے میں ڈال دو۔ اُس نے ایسا ہی کیا۔ آنے جانے والوں نے متعجب ہو کر اس کا سبب پوچھا تو اُس نے ساری کہانی سُنا دی۔ جس نے بھی اسے سُنا اس ہمسایہ کو لعنت ملامت کا ہدف بنایا۔ اُسے بھی یہ خبر پہنچ گئی۔ ندامت کے ساتھ آ کر اپنے پڑوسی سے گھر چلنے کی درخواست کی اور خدا کی قسم کھا کر یقین دلایا کہ وہ آئندہ ایذا نہیں دے گا[3]۔

---

[1] بخاری، الادب المفرد ص ۴۰۔

[2] بخاری، الصحیح ۲/ ۶۷ ، ۱۱۴۔ مسلم ۱/ ۶۳

[3] ابوداؤد، سنن، اصح المطابع کراچی ۱۳۶۹ھ ص ۷۰۱۔ بخاری، الادب المفرد ص ۴۲۔

کوئی جسمانی سزا اس قدر مؤثر نہ ہوتی جتنی یہ نفسیاتی تدبیر کارگر اور عبرت ناک ثابت ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ بُرا پڑوسی سر پر لٹکتی ہوئی تلوار کی طرح ایک مستقل عذاب ہے، جس سے انسان کی جان، مال اور آبرو ہر وقت خطرہ میں رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضورؐ نے خود بھی بُرے پڑوسی سے اللہ کی پناہ مانگی: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ جَارِ السُّوْءِ[1] (اے اللہ! میں بُرے پڑوسی سے تیری پناہ مانگتا ہوں) اور اُمت کو بھی اسی کی تلقین فرمائی کہ (تعوذوا باللّٰہِ مِنْ جار السوء[2]) بُرے ہمسایہ سے اللہ کی پناہ مانگو۔

اس کے برعکس اچھا ہمسایہ اللہ کی رحمت کا سایہ ہوتا ہے جو آڑے وقت میں کام آنے کے لیے ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ یا پھر اس کی مثال اس میٹھے چشمے کی ہے جو انسان کے گھر کے سامنے بہ رہا ہو۔ اور اُسے شاد کام کرنے کے لیے ہر وقت اس کے دروازے پر موجود ہو۔ اسی بنا پر حضورؐ نے بھی اسے انسان کی خوش بختی قرار دیا اور فرمایا: "وسیع گھر، نیک ہمسایہ اور خوشگوار سواری مردِ مسلمان کی خوش بختی کی علامات ہیں[3]"

انسان کو یہ خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اُسے اچھا کہیں، لیکن دراصل اچھا انسان وہ ہوتا ہے جو اپنے سے قریب ترین لوگوں کی رائے میں اچھا ہو۔ اس چیز کو حضورؐ نے نہایت حکیمانہ انداز میں پڑوسیوں کے حُسنِ سلوک کی ترغیب کا ذریعہ بنایا۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نے آپ سے عرض کیا: "یا رسول اللہ! مجھے کیسے معلوم ہو کہ میں اچھا کر رہا ہوں یا بُرا؟" فرمایا: "جب تم پڑوسیوں کو یہ کہتے سُنو کہ تم نے اچھا کیا ہے تو سمجھ لو کہ تم نے اچھا کیا ہے۔ اور جب تم انہیں یہ کہتے سنو کہ تم نے بُرا کیا ہے تو جان لو کہ تم نے

---

[1] بخاری الادب المفرد ص ۴۰
[2] نسائی، سنن، قدیمی کراچی ت۔ ن ۲/ ۳۱۸
[3] بخاری الادب المفرد ص ۴۰

بُرا کیا ہے[1]۔ پڑوسیوں کی رائے کو یہ وزن اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے نیک و بد سے سب سے زیادہ واقف بھی ہوتے ہیں اور اچھے یا بُرے رویّہ کا اوّلین ہدف بھی۔ جو ہمسایوں سے اچھا سلوک نہیں کرے گا، اُسے وہ کیوں اچھا کہیں گے، اور دُور والے اس سے اچھائی کی کیا توقع رکھیں گے۔ گویا پڑوسیوں سے اچھا یا بُرا رویّہ اختیار کرنا دوسرے لفظوں میں اپنی نیکیوں یا بدنامی کا اشتہار دینا ہے۔

پڑوسیوں کے بارے میں حسنِ سلوک کے جو تاکیدی اور بکثرت احکام حضورؐ نے دیئے ہیں۔ ان کی روشنی میں انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ اُسے کس موقع پر کیا رویّہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس کے باوجود بعض خاص اُمور میں ان کے قابلِ نزاع یا زیادہ اہم ہونے کی وجہ سے آپؐ نے خاص ہدایات صادر فرمائیں۔ ان میں سے ایک معاملہ گھر یا جائیداد کی خرید و فروخت کا ہے۔ بعض اوقات کوئی شخص اپنا مکان کسی اور کے ہاتھ بیچ دیتا ہے، حالانکہ ہمسایہ اس کا ضرورت مند ہوتا ہے۔ اس سے آنے اور جانے والے ہمسایوں اور اس کے تعلقات میں ایک ایسی تلخی جنم لیتی ہے جو رستے ہوئے ناسور کی طرح ہمیشہ باعثِ آزار رہتی ہے۔ اور یہ چیز خدا و رسول کے حکمِ احسان کی بالکل ضد ہے۔ اس لیے حضورؐ نے ارشاد فرمایا: الجار اُولی بصقبہ[2] یعنی پڑوسی قرب کی وجہ سے زیادہ حقدار ہے۔ اس سے بعض اوقات ایثار بھی کرنا پڑتا ہے، لیکن اہلِ ایمان ایسا کرتے ہیں۔ تاریخ اس واقعہ کی شاہد ہے کہ حضرت ابورافعؓ کے دو مکان حضرت سعدؓ بن وقاص کی حویلی میں تھے۔ ان کے پانچ سو دینار نقد نہیں مل رہے تھے، لیکن حضرت سعدؓ چار سو سے زیادہ ـــــ اور وہ بھی بالاقساط ـــــ دینے پر تیار نہ تھے۔ حضرت ابورافعؓ نے ان چار سو بالاقساط کو پانچ سو نقد پر ترجیح دی، یہ کہتے ہوئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: الجار اولی بصقبہ[3]

(باقی)

---

[1] احمد، مسند ۱/۴۰۲

[2] بخاری در فتح الباری ابن حجر۔ اسلامیہ لاہور ۱۴۰۱ھ ۱۲/۳۴۵

[3] ایضاً